ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۳۰/۲، جولائی - دسمبر ۲۰۱۵ء

روحانیت قرآن کی نظر میں

محمد سعود عالم قاسمی

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے، جسم ایک مادی وجود ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، ہاتھوں سے چھوا جا سکتا ہے اور حواس کے ذریعہ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے، جبکہ روح غیر مادی وجود ہے، جسے نہ تو چھوا جا سکتا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، مگر انسان کے وجود کے لیے اس حد تک لازم ہے کہ جسم اس کے بغیر باقی نہیں رہتا بلکہ فنا ہو جاتا ہے، روح کا رشتہ جس لمحہ جسم سے منقطع ہوتا ہے انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ مردہ قرار پاتا ہے، جسم اپنے بقا کے لیے روح کا محتاج ہے۔

سوال یہ ہے کہ روح کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ عصر حاضر کے مغربی مفکرین روح کو بھی مادّی شیئ سمجھتے ہیں یعنی جس طرح جسم مادی وجود ہے اسی طرح روح کو بھی مادی وجود تسلیم کرتے ہیں اور ان دونوں مادوں کے اتصال سے انسانی زندگی قائم رہتی ہے، روح سے جدا ہو کر جسم سڑ گل جاتا ہے اور روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ کا کہنا ہے کہ ''ہم اپنے وجود کے اندر نہ تو مافوق الشعور شیئ کو تسلیم کر سکتے ہیں اور نہ اس کے اثرات کا تجربہ کر سکتے ہیں''[1]۔ مگر یہ خیال بہت پرانا ہے۔ عرب کے مشرکین کا بھی تقریباً یہی خیال تھا کہ انسان کی زندگی مادی وجود کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، چنانچہ ان کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیہ: ۲۴/۴۵)	وہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے جہاں ہم جیتے اور مرتے ہیں اور زمانہ ہمیں ہلاک کرتا ہے

قرآن کی نظر میں یہ خیال درست نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کا صرف جسم ختم ہوتا ہے، جبکہ روح اپنے پیدا کرنے والے کے حکم سے اس کے پاس چلی جاتی ہے اور انسان کے اچھے برے عمل کے لیے جوابدہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک نے صراحت کی ہے:

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:۲/۱۵۶) بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے

جسم تو فنا ہو کر مٹی میں مل جاتا ہے، اللہ کی طرف صرف روح جاتی ہے، چنانچہ نیک روحوں کے بارے میں قرآن پاک نے کہا ہے:

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر:۸۹/۲۷-۳۰) اے نفس مطمئن لوٹ چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ اللہ تجھ سے راضی ہو اور تو اللہ سے، پھر داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں

اس روح کے بقا کے راز کو کھولتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

محدثین کے یہاں روح لطیف نورانی وجود ہے اور حکماء اور صوفیہ کے یہاں روح جوہر مجرد ہے، روح شکر اور نمک کی طرح نہیں ہے جو پانی میں گھل جائے اور نہ سیاہی اور سفیدی کی طرح وصف ہے جو سیاہ و سفید شئی میں تحلیل ہو جائے۔ مشہور مفسر قرآن عبداللہ انصاریؒ نے روح کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"انسان کا جسم دل اور روح کا مجموعہ ہے، جسم محل امانت ہے، دل بارگاہ خطاب ہے اور روح نقطہ گاہ مشاہدہ ہے۔ جو کچھ نعمت کے قبیل سے تھی وہ جسم پر نثار ہوئی، جس کی غذا کھانا پینا ہے۔ جو کچھ واحسان کے قبیل سے تھی وہ دل کا تحفہ بنی، جس کی قوت ذکر اور یاد خدا ہے۔ جو کچھ مشاہدات کے قبیل سے تھی وہ روح کے حصہ میں آئی، جس کی غذا دیدار دوست ہے، جسم قدرت کے

قہر میں ہے۔ دل اس کے قبضہ میں اور روح اس کے سایۂ عزت میں ہے"۲۔

یہودیوں کے ایک گروہ نے ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ روح کیا ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی آئی:

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل: ۸۵/۱۷)	وہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ بتا دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے اور تم لوگوں کو (اس بارے میں) بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے

قرآن کی نظر میں جسم کی طرح روح مادی شئی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے مادہ کا محتاج نہیں ہے۔ وہ جس چیز کو بنانا چاہتا ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ شئے وجود میں آ جاتی ہے۔ سورۂ یٰس میں ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یٰس: ۸۲/۳۶)	وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے

روح کی حقیقت یہی ہے کہ وہ مادی ڈھانچہ میں اللہ کی طرف سے ہو جانے کا کلمہ یا حکم ہے۔ جب تک انسان کی حیات مقرر ہے اس وقت تک یہ روح انسانی قالب میں رہتی ہے اور جب یہ مدت تمام ہو جاتی ہے تو روح اس مادی جسم سے نکل کر اپنے پیدا کرنے والے کے یہاں چلی جاتی ہے۔ اگر یہ برے عقیدے اور برے عمل کی حامل رہی ہے تو "سجین" اس کا مقام ہے اور اگر یہ نیک عقیدے و عمل کی حامل رہی ہے تو "علیین" اس کا مقام ہے۔ قرآن پاک میں اس کی وضاحت ان لفظوں میں کی گئی ہے:

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا وَتُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُون (النحل: ۱۱۱/۱۶)	جس دن آئے گی ہر جان، اپنی طرف سوال و جواب کرتی ہوئی اور پورا ملے گا ہر جان کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا

معلوم یہ ہوا کہ انسان کا وجود اس روح کی وجہ سے قائم ہے جو اللہ تعالیٰ کا امر ہے۔ اسی کے اتصال سے انسان زندہ ہے اور اسی کے انفصال سے انسان مردہ ہو جاتا ہے۔ مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''روح کے ساتھ اکثر جگہ قرآن میں امر کا لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً:

قل الروح من امر ربی، و کذلک اوحینا الیک روحا من امرنا، یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ، ینزل الملٰئکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ، امر عبارت ہے کلمۂ کُن سے، یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اس طریقہ پر کی جائے جس پر غرض ایجاد و تکوین مرتب ہو، لہٰذا ثابت ہوا کہ روح کا مبدا حق تعالیٰ کی صفت کلام ہے''[۳]۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہر چیز میں جو ''کُن'' کی مخاطب ہوئی روح حیات پائی جائے۔ بے شک میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہر مخلوق کی ہر ایک نوع کو اس کی استعداد کے موافق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے، یعنی جس کام کے لیے وہ چیز پیدا کی گئی ڈھانچہ تیار کر کے اس کو حکم دینا ''کُن'' (اس کام میں لگ جا) بس یہی اس کی روح حیات ہے''[۴]۔

اللہ تعالیٰ نے یوں تو تمام اشیاء کو مادہ سے پیدا کیا اور ہر جاندار کو اس کے مقصدِ تخلیق اور کام کے لحاظ سے قالب عطا کیا اور جان عطا کی۔ اسی طرح انسان کا قالب بھی مٹی سے بنایا مگر اس کو روحِ خاص عطا کی۔

جب تک انسان مٹی کا پتلا تھا یعنی صرف مادی وجود رکھتا تھا وہ کسی حیثیت کا مالک نہ تھا۔ جب اللہ نے اس قالب میں اپنی روح ڈال دی تو وہ قابل احترام اور لائق تعظیم ہو گیا اور وہ مسجود ملائک بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي	اور یاد کر وہ وقت جب تمہارے رب
خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ	نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ فَسَجَدَ الْمَلَٰئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ إِلَّا إِبْلِيسَ. (ص: ۳۸/۷۱-۷۴)	انسان کا قالب بنانے جارہا ہوں تو جب میں اسے مکمل کردوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤ، چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں اس مٹی کے قالب میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اسے سجدہ کرنا۔ یعنی انسان اپنے مادی وجود کی وجہ سے قابل تعظیم نہ تھا، بلکہ اس روح کی بدولت قابل تعظیم اور سزوارِ سجدہ ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کے قالب میں پھونک دی۔

روحِ انسانی جسم کو صرف زندہ اور متحرک ہی نہیں رکھتی بلکہ اسے فکر و شعور، تصور و خیال اور علم و عمل سے مزین بھی کرتی ہے۔ اسی لیے روح کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی پاکیزگی کے لیے جد و جہد کرنا روحانیت کہلاتی ہے۔ عام طور پر لوگ جسم کی افزائش اور آرائش پر وقت اور سرمایہ صرف کرتے ہیں، عمدہ غذا، خوشنما لباس اور اچھے مکان سے جسمانی راحت حاصل کرتے ہیں، جسم کی اس افزائش میں عموماً روح نظر انداز کردی جاتی ہے، دیکھنے میں صحت منداور طاقت ور آدمی اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے، روحانی طور پر اس بیمار انسان کے بارے میں کہا گیا ہے:

منظر سیاہ پوش نہ پیکر جلا ہوا
ہر شخص اپنی ذات کے اندر جلا ہوا

روحانی دنیا

انسان کی بیرونی دنیا جو جسم کی سیر گاہ ہے جتنی وسیع اور حسین ہے اس سے کہیں زیادہ وسیع اور خوبصورت اندرونی دنیا ہے، جو روح کا محل ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے:

ستم است گر ہوست کشد بسیر سرو سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

(یہ ستم ہے کہ تیری ہوس تجھے باغ وچمن کی سیر کے لیے اکساتی ہے، تم غنچہ سے کسی طرح کم درخشاں نہیں ہو، دل کا دروازہ کھول لو اور اس چمن میں داخل ہوجاؤ)۔

انسان باہر کی دنیا کو کبھی حسرت اور کبھی شوق بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کرتا ہے اور پوری زندگی کھپا دیتا ہے، مگر روحانی دنیا کی قدر و قیمت سے بے خبر رہتا ہے، حالاں کہ پیدا کرنے والے رب نے اپنی خلاقی، رزاقی اور کبریائی کی علامتیں کائنات کے ساتھ ساتھ خود انسان کے اندرون میں پوشیدہ کردی ہیں، قرآن کا ارشاد ہے:

وَفِیْ الْأَرْضِ آیٰتٌ لِّلْمُوقِنِیْنَ وَفِیْ أَنفُسِکُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات:۵۱/۱۹-۲۰)	یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو

قرآن پاک نے روح کو نفس سے بھی تعبیر کیا ہے اور اسی کو اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کا محل قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسّٰهَا. (الشمس:۹۱/۷-۱۰)	اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی اس بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبادیا

معرفت نفس

قرآن پاک کی مذکورہ تعلیم کی روشنی میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ روحانیت کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے۔ نفس کی معرفت حاصل کرنا گویا رب کی معرفت حاصل کرنا ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

من عرف نفسه عرف ربه ۵

(جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلی اس نے گویا خدا کی معرفت حاصل کرلی)

انسان کا نفس اگرچہ ایک جوہر ہے مگر احوال و اعمال کے لحاظ سے اس کی تین حالتیں ہیں، اس لیے اسے تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر نفس نور الٰہی سے منور ہو، اس کی عبادت میں شاد کام ہو اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مسرور و مطمئن ہو تو اسے ''نفس مطمئنہ'' کہا جاتا ہے۔ اگر گناہ کی ظلمت میں نفس گھرا ہوا ہو، نیکی سے وحشت ہو اور برائی سے لذت حاصل کرتا ہو تو اسے ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے، اور اگر کبھی کبھی بدی کی طرف مائل ہو مگر کبھی نیکی کی طرف مائل ہو اور برائی سے اجتناب کرتا ہو، معاصی پر ندامت محسوس کرتا ہو اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہو تو اسے ''نفس لوامہ'' کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے نفس کو ان تینوں ناموں سے یاد کیا ہے۔

روحانیت کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسان نفس کی تمام حالتوں سے اور جملہ حرکتوں سے باخبر ہو، اس کے میلانات سے واقف ہو، اس کے شر و رفتن سے آگاہ ہو اور ان کے اثرات کا اسے علم ہو۔

ضبط نفس

روحانیت کی دوسری منزل ضبط نفس ہے۔ معرفت نفس کے بعد روح کا تقاضہ یہ ہے کہ حرص و ہوس اور خواہشات نفس پر قابو رکھا جائے۔ خواہش انسان و حیوان دونوں میں مشترک ہے۔ دونوں خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں، خواہ یہ خواہش پیٹ بھرنے کی ہو یا جنسی آسودگی کی ہو۔ حیوان خواہشاتِ نفس کی تکمیل میں حدود قیود اور حرام و حلال کی تمیز نہیں رکھتا۔ اسے پیٹ بھرنے کے لیے اور جنس کی آگ بجھانے کے لیے جو کچھ اور جتنا کچھ ملے اس کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے جبکہ انسان بھی شکم اور جنس کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ اگر بے قید ہو کر اس کی تکمیل کرتا ہے تو اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ حیوان کی طرح پست ہوتا ہے یا اس سے بھی گرا ہو۔ اور اگر اس کی تسکین شرعی ضابطہ کے تحت کرتا ہے تو روحانی بلندی حاصل کرتا ہے اور فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔ حیوان بے عقل اور نادان ہے اور فرشتہ دانا اور زیرک ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے انسان کو جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے عقل مند اور دانا انسان قرار دیا

ہے اور جو خواہشات کا غلام بن جاتا ہے اسے نادان اور عاجز فرمایا ہے:

الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت، والعاجز من اتبع نفسه هواها و تمنی علی الله[۶]۔

(عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرتا ہے اور آخرت کے لیے عمل کرتا ہے اور عاجز انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے حوالہ کر دیتا اور اللہ سے تمنائیں کرتا رہتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی اور ناکامی جنت وجہنم کا فیصلہ خواہشات نفس کی تعدیل اور تکمیل پر موقوف کیا ہے، ارشاد ہے:

فَأَمَّا مَن طَغَى وَآثَرَ الْحَيٰوةَ	تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کو ترجیح
الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى	دی تھی، دوزخ اس کا ٹھانا ہوگا اور جس
وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى	نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے
النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ	کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات
الْمَأْوٰى (النازعات:۷۹/۳۷-۴۱)	سے باز رکھا تھا جنت اس کا ٹھکانا ہوگی

انسان جب حیوان کی طرح خواہشاتِ نفس کے پیچھے چلتا ہے اور ان کا اسیر ہو جاتا ہے تو یہی خواہش خدا کی جگہ لے لیتی ہے۔ انسان حقیقی خدا کی فرماں برداری کی جگہ خواہشِ نفس کی فرماں برداری کرنے لگتا ہے اور نفس پرستی اس کا مقصد زندگی بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بندۂ نفس کی ملامت کرتے ہوئے کہا ہے:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ	کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس
أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا	نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا ہے کیا
(الفرقان:۲۵/۴۳)	آپ اس کی ذمہ داری لے سکتے ہیں

خواہش نفس کی بندگی اللہ کی بندگی کے منافی ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعاً لما جئت به[۷]۔

(تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات

میری شریعت کے تابع نہ ہو جائے)۔

نفس کی منہ زور خواہشات کی اتباع شیطانیت ہے اور ترک خواہشات روحانیت ہے۔ مولانا رومی نے اس نکتہ کو حسب ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

نفس و شیطان ہر دو یک تن بودہ اند　　در دو صورت خویش را بنمودہ اند

نفس اور شیطان دونوں ایک قالب ہیں اور دو صورتوں میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔

روحانیت کا اعلیٰ مقصد

انسان اپنے نفس پر قابو اسی وقت پا سکتا ہے جبکہ اس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد ہو۔ وہ اپنی خواہشات کو ترک اسی وقت کر سکتا ہے جبکہ اسے کسی بڑے نصب العین تک پہنچنا مطلوب ہو۔ یہ اعلیٰ مقصد اور پاکیزہ نصب العین کیا ہے جس کے لیے انسان ترکِ خواہشات کرتا ہے اور نفس کو لذتوں سے محروم کرتا ہے؟ قرآن کی نظر میں یہ نصب العین خالقِ کائنات، مالکِ برحق اور معبودِ حقیقی کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ	اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ	جان کو اللہ کی مرضی کے عوض بیچتے ہیں
رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ (البقرہ:۲/۲۰۷)	اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے

مولیٰ کی مرضی اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر خواہشات دنیا کا سودا کرنے والے مومنوں کا حال قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ	لوگوں کے لیے مرغوب و مزین
النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ	کر دی گئی ہے، عورتوں، بیٹوں،
الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ	سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ	گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتی کی محبت،
وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ	یہ دنیا کی زندگی کا حقیر سامان ہے،
الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ	کہہ دیجئے کہ کیا بتاؤں تم کو اس سے
قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ	بہتر چیز، جن لوگوں نے پرہیزگاری

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ (آل عمران:۳/۱۴-۱۵)

کی زندگی اختیار کی ان کے لیے ان کے رب کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں پر نگاہ رکھے ہوا ہے

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اللہ کی رضا میں اپنی خواہشات کو فنا کر دینے کی حکمت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

رضا گم اپنی کر اس کی رضا میں — نہ پڑ ہرگز خودی کی تو بلا میں
بس اب اللہ بس اللہ بس ہے — سوا اس کے جو ہے باقی ہوس ہے

روحانیت اور تعلق باللہ

اللہ کی رضا کا حصول روحانیت کا سب سے بلند مرتبہ ہے۔ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مضبوط قلبی تعلق مطلوب ہے اور یہی عبادت کی روح ہے۔ جبرئیل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے، آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك[۸]۔

(اللہ کی عبادت اس طرح کیجئے کہ گویا آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو اتنی کیفیت پیدا کیجئے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کے روبرو ہونا بندگی کا کمال ہے، مگر اس کیفیت کا دل میں پیدا ہونا پاکیزگی قلب اور انابت کی گہرائی چاہتا ہے۔ خدا کو دیکھنے کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اعضاو جوارح کی تربیت کے ساتھ نفس کا تزکیہ اور دل کی خشیت ضروری ہے۔ اس سے نیچے کی منزل یہ ہے کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ خدا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تصور بھی انسان کے دل کو بدل دیتا ہے اور نفس کے شرور و فتن کو زائل کر دیتا ہے، یہی اخلاص ہے۔

اخلاص

ایک مزدور کو اگر یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک موقع پر موجود نہیں ہے تو وہ کام میں سستی کرتا ہے، وقت ضائع کرتا ہے اور کام کرتا بھی ہے تو بے دلی سے کرتا ہے، کام کا مطلوبہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ لیکن اگر کسی مزدور کو یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک اس کے سامنے کھڑا ہے تو کام میں چستی دکھاتا ہے، جی لگا کر کام کرتا ہے اور وقت گذاری سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی طرح بندہ کو یہ احساس ہو جائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے دل کی کیفیت اور جسمانی عمل کی حالت بدل جاتی ہے، اس کی عبادت میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

عبادت سے مراد صرف نماز نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عبادت ہے اور ہر عبادت اپنی قبولیت کے لیے اخلاص چاہتی ہے۔ اللہ کی رضا جوئی، بے لوث بندگی، اللہ سے خوف و امید کے ساتھ طلب قبولیت کے دروازے کھولتی ہے۔ کسی عمل میں نام و نمود اور ریا کاری شامل ہو جاتی ہے تو اللہ اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور وہ عمل مقبول نہیں ہوتا، اسی لیے اللہ کا حکم ہے:

فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر:۳۹/۲-۳)

اللہ کی عبادت کرو اس کے لیے دین کو خالص کر کے، آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ کے لیے ہے

صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، غربا پروری اور ناداروں کی حاجت روائی سب انسانیت کی بھلائی اور روحانیت کی ترقی کا عمل ہے، مگر اس کی شرط بھی اللہ کی رضا جوئی ہے، ارشاد ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيْناً وَيَتِيْماً وَأَسِيْراً إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوراً إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوساً قَمْطَرِيْراً (الدھر:۷۶/۸-۱۰)

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ، ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا

اللہ کا ذکر دل کی زندگی ہے

اخلاص کے لیے اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس ضروری ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کا استحضار اور اس کا ذکر کرتے رہنا روحانیت کی شاہِ کلید ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقٰى إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولٰى صُحُفِ إِبْرٰهِيمَ وَمُوسٰى (الاعلیٰ: ۸۷/۱۵-۱۹)

بے شک وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اپنا تزکیہ کیا، اپنے رب کے اسم گرامی کا ذکر کیا اور نماز ادا کی، بلکہ تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو جب کہ آخرت باقی رہنے والی اور بہتر ہے، یہ بات گزشتہ آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے، صحیفہ ابراہیمؑ اور صحیفہ موسیٰؑ میں

اللہ کے ذکر سے روحانیت جلا پاتی ہے اور روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے، یہ بات پہلے بھی تمام آسمانی صحیفوں میں بیان کی گئی ہے اور اس قرآن میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (الاحزاب: ۳۳/۴۲)

اے ایمان والو! اللہ کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو

دل میں اللہ کی یاد اور زبان سے اس کا ذکر قلب انسانی کو تر و تازہ رکھتا ہے، ذکرِ الٰہی روح کی غذا ہے، جس دل میں خدا کی یاد ہو وہ زندہ ہے اور جو دل یادِ خدا سے غافل ہو وہ مردہ ہے، قرآن نے یہ راز اس طرح عیاں کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (الرعد: ۱۳/۲۸)

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے طمانیت پاتے ہیں آگاہ ہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو تسکین ملتی ہے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روحانی نکتہ کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

مثل الذی یذکر ربه و الذی لا یذکره مثل الحی و المیت۹۔

(اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد کرتا ہے زندہ کی ہے اور اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد نہیں کرتا مردہ کی ہے)۔

قرآن کی نظر میں ہر سانس لینے والا انسان زندہ نہیں ہے بلکہ ذکر کرنے والا انسان زندہ ہے، جسمانی زندگی کھانے سے اور سانس لینے سے قائم رہ سکتی ہے مگر روحانی زندگی یادِ خدا کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اسلام کے احکام تو بہت سے ہیں مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جسے میں لازم پکڑلوں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا یزال لسانك رطباً من ذکر اللّٰه"۱۰۔

(تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رہے)۔

اللہ کے ذکر کی ایک تو عمومی شکل ہے کہ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، صبح و شام اللہ کے نام کا ورد کیجئے، اس کی تسبیح و تقدیس کیجئے، جس کا حکم قرآن پاک میں اس طرح دیا گیا ہے:

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَخِيْفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالآصَالِ وَلاَ تَكُن مِّنَ الْغٰفِلِيْن (الاعراف: ۲۰۵/۷)	اپنے جی میں اپنے رب کا ذکر کرو، عاجزی اور خاموشی اور کم آواز سے صبح و شام اور غافلوں میں نہ ہو جاؤ

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيّاً وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (الروم: ۱۸/۳۰)	اللہ سزاوارِ تسبیح ہے، جب تمہاری شام ہو اور جب تمہاری صبح ہو، اسی کے لیے آسمان و زمین میں حمد ہے، رات میں بھی اور جب تمہارا دن ہو

اللہ کا ذکر انسان کے میل کچیل کو دھو دیتا ہے، دل کی سختی کو دور کر کے خشیت و انابت

پیدا کر دیتا ہے اور اسے بارگاہِ رب العزت میں نذر کر کے قابل بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ	سچے اہل دل تو وہ لوگ ہیں جن کے
اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ	دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور
عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَى	جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (الانفال: ۲/۸)	جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے
	اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی ذکر کے لیے بہت سے وظائف کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سب سے آسان اور مقبول ذکر ہے "سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم" رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کلمتان خفیفتان عل اللسان، ثقیلتان فی المیزان، حبیبتان الی الرحمٰن۔ سبحان اللّٰہ و بحمدہ، سبحان اللّٰہ العظیم"[۱۲] (دو جملے رحمٰن کو بہت بہت پسند ہیں، وہ دونوں جملے زبان پر ہلکے اور میزان میں بھاری اور رحمٰن کو محبوب ہیں، سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم)۔

اللہ کے ذکر کی دوسری شکل خاص اور ضابطہ بند ہے اور وہ نماز ہے جو پانچ وقتوں میں فرض ہے اور بقیہ اوقات میں نفل ہے۔ نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اقم الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ: ۱۴/۲۰) [نماز قائم کر میری یاد کے لیے]۔

ذکر کی منظم اور مکمل صورت نماز ہے، اسی لیے نماز کو مومن کی معراج فرمایا گیا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: "ان احدکم اذا صلّٰی یناجی ربہ"[۱۳] (جب تم میں سے کوئی نماز ادا کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے)۔

بندہ کا خدا سے، حبیب کا محبوب سے مکالمہ وجد انگیز، روح پرور اور حاصل زندگی ہوتا ہے، یہ مقام انسان کو نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ	نماز قائم کرو دن کے کناروں میں اور
وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ	رات کے حصہ میں، بے شک نیکیاں
يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى	برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں، یہ نصیحت

لِلذّٰكِرِيْنَ (ہود:۱۱/۱۱۴) ہے ذکر کرنے والوں کے لیے۔

عمومی ذکر کا اعتبار اسی وقت ہوتا ہے جب انسان ذکر خصوصی یعنی نماز کا اہتمام کرتا ہو، جو شخص فرض نمازوں کا پابند نہیں وہ لاکھ ذکر الٰہی کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ معتبر نہیں، کیوں کہ ایمان اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز ہے۔ جو شخص خدا کا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس کے آگے سر جھکانے سے اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے کیسے روگردانی کر سکتا ہے:

اعمال صالحہ

نماز کے علاوہ دوسری تمام عبادات کا اہتمام کرنا، جیسے صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، روزہ، حج، جہاد اور ان عبادات کے علاوہ تمام اعمال صالحہ کا التزام کرنا روحانیت کے لیے لازم ہے۔ صرف کلمۂ توحید کا اقرار کرنا اور شرک وکفر سے پرہیز کرنا روحانی زندگی کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ نیک عمل کو زندگی کا طریقہ اور وظیفہ بنالینا ضروری ہے۔ روحانیت کے لیے اعمال صالحہ کا اہتمام کرنے کی ضرورت اور حکمت کیا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

> ''عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا دار و مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسانیت کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے، ہر قسم کی کامیابیوں کا انحصار انہی دو باتوں پر ہے، کوئی مریض صرف اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز وفلاح کے لیے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے''[۱۳]۔

عمل صالح کا اہتمام کرنے سے انسان اللہ کی نظر میں بھی محبوب ہوجاتا ہے اور دوسرے انسان بھی اس سے محبت اور ان کی عزت کرنے لگتے ہیں، یعنی جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوتا ہے وہ بندوں کی نظر میں بھی محبوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم:۹۶/۱۹)	جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کا اہتمام کیا عنقریب رحمٰن ان کو دوست بنائے گا

ترک معاصی

اعمال صالحہ کا فائدہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ برے اعمال، برے خیالات اور بری باتوں سے اجتناب کرے۔ اعمال صالحہ روحانی امراض کے لیے دوا ہیں اور بری باتوں سے دور رہنا پرہیز کے درجہ میں ہے۔ جب تک مریض پرہیز نہیں کرتا دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (الانعام:۱۲۰/۱۶)	ظاہری اور باطنی ہر قسم کی برائی ترک کردو

برے اعمال اور برے خیالات کا اثر انسان کے قلب و ذہن پر پڑتا ہے اور اسے روحانی کیفیات کا حامل بننے سے روکتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (المطففین:۱۴/۸۳)	ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ بن جاتا ہے، اگر وہ اس سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو وہ سیاہی زائل ہوجاتی ہے، اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو سیاہی زیادہ ہوجاتی ہے، یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے[۱۴]۔

اس لیے روحانیت کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اوصاف رزیلہ انسان کے دل سے نکل جائیں اور دوسری منزل یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا دل خوگر ہوجائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ واستغفار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (النور:۲۴/۳۱) اے مومنو! تم سب اللہ سے توبہ کرو تا کہ فلاح پاؤ

توبہ واستغفار

انسان سے دانستہ اور نادانستہ خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ توبہ ان خطاؤں سے معافی کا دروازہ کھولتا ہے اور اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتا ہے۔ اللہ کو وہ بندہ پسند ہے جو غلطی کرے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حضرت آدمؑ اور ابلیس دونوں سے غلطی سرزد ہوئی، حضرت آدم کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے منع کرنے کے باوجود انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا اور ابلیس کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے حکم دینے کے باوجود حضرت آدم کو سجدہ نہ کیا، دونوں خطا کار تھے مگر ایک راندۂ دربار ہوا اور دوسرے نے معافی اور محبت پائی، اس لیے کہ دونوں کے رویہ میں بڑا فرق تھا۔

پہلا فرق یہ تھا کہ حضرت آدم نے اپنی غلطی کا اقرار کیا مگر ابلیس نے اپنی غلطی کا اقرار نہیں کیا، دوسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدم اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور ابلیس کو اپنی غلطی پر ندامت نہیں ہوئی۔ تیسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدم نے اپنی غلطی کو اپنے نفس کی خطا قرار دیا اور ابلیس نے اپنی غلطی کو خدا سے منسوب کیا اور کہا "رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي (اے رب تو نے مجھے گمراہ کیا)۔ چوتھا فرق یہ تھا کہ حضرت آدم نے گڑگڑا کر توبہ کی اور کہا "رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور رحم نہ کرے تو ہم خسارے میں مبتلا ہو جائیں گے) اور ابلیس توبہ کرنے کے بجائے گناہ پر قائم رہا۔ ابلیس کا یہ رویہ غلطی پر اصرار و سرکشی کا تھا، حضرت آدم کا رویہ عاجزی کا تھا، ابلیس نے استکبار کیا، حضرت آدم نے استغفار کیا، اسی فرق نے دونوں کے انجام کو جدا کیا، ابلیس ملعون ہوا اور حضرت آدم محبوب ہوئے۔

صبر وتوکل کا التزام

روحانی اعمال و وظائف کی پابندی کرنا اور منکرات و خواہشات سے اجتناب کرنا صبر چاہتا ہے، اس راہ میں مشکلات و موانعات ہیں، تکالیف اور شدائد ہیں ان کو انگیز کرنا پڑتا

ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو صبر کی تلقین کی ہے اور صبر ہی پر آخرت کا اجر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ. (الزمر:۳۹/۱۰)	صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا

صبر انسان کو حرص و ہوس سے بچاتا ہے اور گناہ اور شہوات سے بھی دور رکھتا ہے، صبر وقتی بھی ہوتا ہے اور دائمی بھی، روحانی زندگی دائمی زندگی ہے اس لیے صبر کو ہمیشہ اختیار کرنا مومن کی شان ہے۔ اس کے لیے نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں خصوصاً محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کے اتباع کا حکم قرآن پاک میں اس طرح دیا گیا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۴۶/۳۵)	جس طرح عالی ہمت رسولوں نے صبر کیا اس طرح صبر کرو۔

حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ انصار کے کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سوال کیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمایا، انھوں نے پھر سوال کیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عطا فرمایا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا مال ان کو دینے کے بعد فرمایا کہ میرے پاس جو مال آتا ہے وہ تم سے بچا کر نہیں رکھتا، اب جو شخص اللہ سے عفت چاہتا ہے اللہ اس کو عفیف بنا دیتا ہے اور جو استغناء طلب کرتا ہے اس کو مستغنی بنا دیتا ہے اور جو کوشش کر کے صبر اختیار کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور کسی شخص کو صبر سے بہتر اور وسیع عطیہ نہیں دیا گیا[۱۵]۔

انسانی اذیتوں، آسمانی بلاؤں اور دنیوی مشکلات و مصائب پر صبر کرنے کے ساتھ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے، اسباب و وسائل سے بھی کام لے مگر ان پر بھروسہ نہ کرے، بلکہ بھروسہ صرف اللہ پر کرے، کیونکہ مشکلات اللہ کی طرف سے آتی ہیں، وسائل و اسباب کو اللہ پیدا کرنے والا ہے اور وہی وسائل سے ماورا ہو کر انسان کی مدد کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ	جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس

اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْئٍ قَدْراً (الطلاق:۶۵/۳)	کے لیے کافی ہے، اللہ اپنا کام انجام تک پہنچاتا ہے، ہر چیز کے لیے اس نے پیمانہ مقرر کر رکھا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب رسولوں کو توکل کی تفہیم اس طرح دی ہے:

وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰی مَا آذَیْتُمُونَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُونَ (ابراہیم:۱۴/۱۲)	اور ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں، جبکہ اس نے ہمیں ہماری راہیں دکھائیں، اور ہم تمہاری اذیتوں پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے

مال و دولت روحانیت کے منافی نہیں

فقر و درویشی روحانیت کے لیے موزوں ہے مگر لازمی نہیں ہے۔ مال و دولت روحانیت کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ حلال طریقہ سے کمائی جائے اور اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ اگر حقوق اللہ ادا کرتے ہوئے مال و دولت حاصل کیا جائے تو یہ مذموم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَن ذِکْرِ اللّٰہِ وَإِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَإِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ (النور:۲۴/۳۷)	یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہیں روکتی

غریبوں، ناداروں اور محتاجوں پر مال و دولت خرچ کرنا روحانیت کا طریقہ ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان کے پاس مال و دولت ہو، مال داروں پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے اور ان کو صدقات کی تعلیم دی ہے، ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یُنفِقُونَ أَمْوَالَھُم بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرّاً وَعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ أَجْرُھُمْ عِندَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُونَ	جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں، پوشیدہ اور ظاہری طور پر، ان کے لیے ان کا اجر ہے، ان کے رب کے پاس، نہ ان کو کوئی خوف

ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (البقرہ:۲/۲۷۴)

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا تزکیہ نفس کا بڑا ذریعہ ہے۔غریبوں پر مال خرچ کرنے سے دولت بھی پاک ہوتی ہے اور انسان کا نفس بھی پاک ہوتا ہے۔صحابہ کرامؓ میں بہت سے نادار تھے اور بہت سے مال دار۔مال دار صحابہ، نادار صحابہ سے کسی طرح بھی روحانیت میں کم نہ تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے تمام احکام بجالاتے تھے اور جو دولت ان کے پاس تھی اسے ناداروں، محتاجوں اور جہاد میں خرچ کرتے تھے۔اگر مالداری روحانیت کے منافی ہوتی تو یہ حضرات ہرگز اسے گھر میں آنے نہ دیتے، کیوں کہ یہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور ان کے جانشین تھے۔حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے صحابہ دولت وثروت میں ممتاز تھے، تو انفاق فی سبیل اللہ اور غربا پروری میں بھی بے مثال تھے، چنانچہ ان کا روحانی مقام بھی بہت بلند تھا۔

حکومت روحانیت کے منافی نہیں

دولت کی طرح حکومت اور قیادت بھی روحانیت کے منافی نہیں ہے، بشرطیکہ خواہش نفس کی تکمیل کے لیے اور عوام پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے نہ کی جائے۔ حکومت اور قیادت کو دنیاداری کا کام سمجھا جاتا ہے اور روحانیت کو اس سے دور خیال کیا جاتا ہے، مگر قرآن کی نظر میں حکومت اور روحانیت میں تضاد نہیں ہے۔اگر حکومت اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے کی جائے، انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ کی جائے اور اللہ کے احکام کو اللہ کی زمین میں نافذ کرنے کے لیے کی جائے تو یہی روحانیت کا تقاضا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (الحج:۲۲/۴۱)	ان لوگوں کو جب ہم زمین میں اقتدار عطا کرتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں

نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور نیکی کی اشاعت کرنا خالص روحانی عمل ہے اور یہ حکمرانوں

کی ذمہ داری ہے، اگر وہ اس ذمہ داری کو نبھائیں تو مسند حکومت پر سرفراز ہونے کے باوجود وہ روحانی ہستیاں ہیں، انبیاء علیہ السلام سے زیادہ روحانی شخصیت دنیا میں کس کی ہوسکتی ہے، مگر غور کیجئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے وقت کے عظیم الشان بادشاہ ہیں اور ایسے صاحب شوکت وحشمت کہ چرند پرند اور ہواؤں پر بھی حکومت ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ اللہ کے جلیل القدر نبی بھی ہیں اور روحانیت کے امام بھی ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی ہے:

رَبِّ أَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اے میرے رب مجھے داخل کر سچائی
وَأَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ	کے ساتھ داخل کرنا اور مجھے نکال سچائی
وَاجْعَل لِّیْ مِن لَّدُنکَ سُلْطَاناً	کے ساتھ نکالنا اور میرے لیے اقتدار
نَّصِیْرا (بنی اسرائیل: ۱۷/۸۰)	کو مددگار بنادے

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی روحانی ہستی نہیں پیدا ہوئی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار کے لیے دعا کرنا اور پھر مدینہ پہنچ کر اسلامی ریاست قائم کرنا روحانیت کے منافی نہیں ہے بلکہ روحانیت کو مضبوط اور وسیع کرنے کے لیے ہے، تاکہ زمین پر شیطان کی حکومت ختم ہو اور رحمان کی حکومت جاری وساری ہو، اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی بندگی کا ماحول سازگار ہو، نفسانیت کا خاتمہ ہو، روحانیت کا بول بالا ہو۔

جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ مثالی حکمراں تھے۔ دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے اسوہ اور رہنما تھے اور اسی کے ساتھ وہ روحانیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ آج کی روحانی ہستیوں کا کمال یہ ہے کہ وہ ان خلفاء راشدین کے نقش قدم تک پہنچ جائیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں جس اعتدال وتوازن کی ضرورت ہے وہ ان پاک ہستیوں سے سیکھیں۔

روحانیت مطلوب ہے رہبانیت نہیں

قرآن نے روحانیت کی جو تعلیم دی ہے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد یعنی اللہ اور بندوں کے حقوق کی یکساں ادائیگی کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے انسان سماج میں

رہ کر دنیا کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی روحانی پاکیزگی کا اہتمام کرے۔ سماج سے کٹ جانا، گوشہ نشینی اختیار کر لینا، لوگوں کی حاجت روائی سے روگردانی کرنا اور انسانی حقوق کی ادائیگی سے غفلت برتنا روحانیت کے منافی ہے۔ انسانوں کی فیض رسانی کرنا اور ان کی تکالیف پر صبر کرنا روحانیت کا تقاضا ہے، جبکہ رہبانیت ترکِ دنیا کی تعلیم دیتی ہے، انسانی سماج سے علیحدہ ہو جانے اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر یادِ خدا میں زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ رہبانیت اللہ کو مطلوب نہیں ہے اور اسلام نے اس کی تعلیم نہیں دی ہے کیوں کہ اسلام اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کو روحانی زندگی کا مشن قرار دیتا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> "اکثر مذاہب نے دین داری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا ہے، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کا نام ہے، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے، اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں"[۱۶]۔

ازواج واولاد روحانیت کے منافی نہیں

روحانیت کی راہ عبادت ہے اور عبادت کے لیے انسان یکسوئی چاہتا ہے۔ اس یکسوئی کے لیے کبھی وہ تجرد کی زندگی اختیار کر لیتا ہے، یعنی ازواج واولاد کی ذمہ داریوں سے گریز کرتا ہے، اگرچہ تجرد کی زندگی اسلام کی نظر میں حرام نہیں ہے مگر مطلوب بھی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی روحانی ہستیاں ازواج واولاد کی حامل تھیں، ان انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے گو کہ شادی نہیں کی اور ان کے بال بچے نہیں تھے مگر انبیاء علیہ السلام کی عظیم اکثریت ان پر مشتمل تھی جنھوں نے شادی کی اور ازواج واولاد کے حامل ہوئے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں کیں اور صاحب اولاد ہوئے، اس لیے کہ روحانیت کے لیے تجرد کی زندگی مطلوب نہیں ہے بلکہ بال بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ روحانی زندگی مطلوب ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو یہ دعا کرنے کی تعلیم دی ہے:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا	اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں
قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ	اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک
إِمَاماً (الفرقان: ۷۴/۲۵)	دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا

قبر پرستی روحانیت کے منافی ہے

روحانیت کی علامت صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہے، اس کے برعکس آج کے عہد میں روحانیت کے لیے مخصوص علامتیں اور رسمیں وضع کر لی گئی ہیں۔ اس ظاہر داری کا روحانیت سے تعلق نہیں ہے، بلکہ بعض رسمیں روحانیت کے لیے نقصان دہ اور مہلک ہیں۔ ان ہی میں ایک رسم بزرگوں اور نیک بندوں کی قبروں کو مزین کرنا، ان پر چراغاں کرنا اور ان کو حاجت روائی کے وسیلہ کے طور پر اختیار کرنا اور ان کو مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے اور مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی تعلیم تو دی ہے مگر قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے:

وان من كان قبلكم كانوا يتخذون قبور انبياء هم وصالحيهم مساجدا، فلا تتخذوا القبور مساجدا إني انهكم عن ذلك ۱۷۔

(تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، تم لوگ قبروں کو مسجد نہ بنالینا میں تم کو اس سے روکتا ہوں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ نے حبشہ کے ایک چرچ کا تذکرہ کیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لوگوں کے یہاں جب کسی نیک انسان کا انتقال ہوتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی تصویر لٹکا دیتے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں قیامت تک ۱۸۔

قبریں خواہ انبیاء کی ہوں یا بزرگوں کی وہ حاجت روائی کا ذریعہ نہیں ہیں اور نہ عبادت کا مرکز ہیں، بلکہ وہ صرف موت کو یاد کرنے کا مقام ہیں، ان کے اسوہ پر چلنے کی ضرورت ہے اور ان کی روحانی تعلیم پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

مسجدیں روحانی کا مرکز ہیں

قبروں کے مقابلہ میں مسجدیں حاجت روائی کا وسیلہ اور روحانیت کا مرکز ہیں چوں کہ مسجد میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور عبادت کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے، اس سے فریاد کی جاتی ہے، اس سے حاجت روائی کی دعا مانگی جاتی ہے اور خدا اپنے بندوں کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس لیے روحانیت کا اس سے بہتر اور کوئی مرکز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فِيْ بُيُوتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَن تُرْفَعَ	اللہ کا نور ان گھروں میں پایا جاتا ہے
وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ	جس میں اپنے نام کا ذکر کرنے اور اسے
فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ	بلند کرنے کا حکم دیا، ان گھروں میں صبح و
(النور:۲۴/۳۶)	شام اس کی تسبیح بیان کی جاتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ سات لوگ جو قیامت کے دن اللہ کے سایہ میں ہوں گے ان میں ایک شخص وہ ہے جس کا دل مسجد میں لگا ہوا ہو[۱۹]۔ یعنی جس شخص نے مسجد میں پابندی سے نماز ادا کرنے کو وظیفۂ زندگی بنالیا ہے وہی سایۂ خداوندی کا مستحق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت اور بندگی روحانیت ہے۔ اللہ کے حکم پر عمل کرنا اور غیر اللہ سے کنارہ کشی کرنا روحانیت کی شاہ کلید ہے۔

حواشی ومراجع

1- ***Encyclopedia of Religions and Ethics*** (Spirit) New York, 1958, voll. xi, p. 83

۲- خواجہ عبداللہ انصاری، کشف الاسرار و عمدۃ الابرار، تہران، ۱۳۷۱ھ، ۵/۲۲۶

۳- ترجمہ قرآن، مولانا محمود الحسن، تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف، مدینہ منورہ، بدون تاریخ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت/۸۵، حاشیہ نمبر۴)، ص ۳۸۷

۴- ترجمہ قرآن، مولانا محمود الحسن، تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی (سورۂ بنی اسرائیل، آیت/ ۸۵، حاشیہ-۴)، ص ۳۸۸

۵- محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی، المقاصد الحسنة، مطبع علوی، ۱۳۰۴ھ، ص ۱۹۸
۶- سنن ترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع، باب من دان نفسه و عمل لما بعد الموت
۷- مشکوٰة المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنة
۸- الجامع الصحیح للمسلم، کتاب الایمان، بیان الایمان والاسلام والاحسان
۹- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر الله
۱۰- سنن ترمذی، ابواب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الذکر
۱۱- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات ، باب فضل التسبیح
۱۲- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب مواقیت الصلوٰة، باب المصلّی یناجی ربه
۱۳- سید سلیمان ندوی، سیرة النبی ﷺ، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ۱۱/۵
۱۴- ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذکر الذنوب
۱۵- الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب الصبر عن محارم الله
۱۶- سیرة النبی ﷺ، ۳۱/۵
۱۷- الجامع الصحیح للمسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور فیها والنهی عن اتخاذ القبور مساجد
۱۸- الجامع الصحیح للمسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور فیها والنهی عن اتخاذ القبور مساجد
۱۹- الجامع الصحیح للبخاری کتاب الأذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوٰة و فضل المساجد